کائنات، جیسی کہ اللہ نے پیدا کی ہے، اپنے اندر بے شمار اسرار و رموز کی حامل ہے۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور اسی بارش سے اس سرزمین پر مختلف رنگوں کی فصلوں کا پیدا ہونا ایک ایسا مبہوت کر دینے والا عمل ہے جس پر غور و فکر انسان پر خشیت الٰہی طاری کر دیتی ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں اصل عالم کہا جا سکتا ہے: ﴿ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ﴾۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف یہ فیصل کرنے بیٹھ گئے کہ دیگر قومیں جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ان کا کون سا عمل شریعت میں مباح ہے اور کون سا حرام؟ یا یہ کہ ان کی کن ایجادات کو لائق استعمال قرار دیا جا سکتا ہے اور کون سی ایجاد پر عدم جواز کا فتویٰ چسپاں کیا جا سکتا ہے؟ تو یہ ذہنی رویہ ہمیشہ ہمیں محض ان کے تعاقب میں مشغول رکھے گا اور ہم کبھی اس لائق نہیں ہو سکیں گے کہ دنیا ہماری اتباع اور اقتداء میں چلے۔

۲

عقل بنام فتویٰ

اگر دودھ میں اس درجہ ابال آ گیا ہو کہ اس کے گر کر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں کیا سائل کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ فی الفور چولہے سے دودھ اتار لے جب کہ ایسا کرنے میں ہاتھ کے جل جانے یا ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ہاتھ کا جلنا نقصِ نفس سے عبارت ہے تو دودھ کا ضائع ہونا نقصِ مال پر مبنی ہے۔ ایسی صورت میں کس نقصان کو اولیت دی جائے گی؟ اھون البلیتین کا فقہی اصول کیا کہتا ہے؟ لا ضرر و لا ضرار، المشقة تجلب التیسیر جیسے معروف فقہی اصولوں کی روشنی میں سائل کے لئے مال اور نفس کے مابین کسے ترجیح دینا قرینِ دین ہوگا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن پر کسی شرعی رہنمائی کے لئے فقہاء کو مزید معلومات درکار ہوگی۔ مثلاً یہ کہ سائل کی معاشی صورتحال کیا ہے؟ دودھ کی واقعی مقدار کیا ہے؟ کیا دودھ کا زیاں اس کی معاشی حیثیت پر اثر انداز ہوگا؟ کیا دودھ اس کی ملک ہے یا وہ ملازم کی حیثیت سے اس کا امین ہے جس کے سبب امانت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اس پر اضافی طور پر عائد ہو جاتی ہے؟ یہ اور اس قبیل کی بہت سی موشگافیاں اس سوال کو ایک فقہی سوال بنانے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں عام زندگی میں عام مسلمان نفس اور مال کے مابین نقص کا یہ میزانیہ خود ہی طے کر لیتا ہے۔ کسی صاحب افتاء یا اہل شرع سے رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ انسان کے اندر in-built عقل فی الفور اس بات کا فیصلہ کر لیتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ کسی ایسے فیصلہ کے لئے جہاں دودھ کے گرنے اور ہاتھ کے جلنے کے مابین چند

ثانیہ کا فاصلہ بھی نہ ہو انسانی عقل بڑی سرعت کے ساتھ مناسب ترین فیصلہ لیتی اور اسے فی الفور منطبق کر دیتی ہے۔ جب یہ سب کچھ اللہ نے انسان کے لئے اتنا فطری بنایا ہے تو پھر آخر اس بات کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے کہ مختلف امور پر اصحاب فتاویٰ سے رائے لی جائے اور عام انسان اپنی عقل کے بجائے دوسروں کی عقل پر انحصار کو لازم خیال کرے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہاتھ کا جلنا اور دودھ کے گرنے کے مابین کسی ایک نقصان کو قبول کرنے کا معاملہ امورِ دنیا سے متعلق ہے۔ دین کے معاملات میں عقل وفہم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کے مغالطہ ہونے سے خود اہل فتاویٰ بھی خوب واقف ہیں۔

اس بات کے تو سبھی قائل ہیں کہ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تقسیم نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود اہل فتاویٰ اپنی قیل وقال کو دینی علوم پر محمول کرتے ہیں اور اس حوالے سے عام مسلمانوں سے اس بات کے طالب بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان کے فتاویٰ یا آراء کو تقدیس کے ہالے میں گھرا دیکھیں۔ جب اسلام دین اور دنیا کی تفریق کا قائل نہیں تو پھر یہاں دینی یا دنیوی علوم کی تقسیم کا کوئی جواز ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی گنجائش کے انسانوں کا کوئی طبقہ اپنے آپ کو دینی علوم کا ماہر بتائے اور عام انسانوں کو دین کے حوالے سے اپنی اتباع کی دعوت دے۔ قرآن مجید میں دین اور دنیا کا لفظ ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ قرآنی تصورِ حیات میں تو دنیا اور آخرت کا لفظ بھی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ متاعِ حیاتِ دنیا کی فنا کاریوں کے باوجود اسے حصول آخرت کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور انسان کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے حصے کو نہ بھولے ﴿ ولا تنس نصيبك من الدنيا ﴾ (القصص: ۷۷)

یہ بات اہل فتاویٰ کو ہم سے کہیں زیادہ معلوم ہے کہ قرآن میں دین کا لفظ کسی مجموعۂ رسومِ عبادات کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ دینِ حق خدا پرستوں کی غیر مشروط عبودیت سے عبارت ہے۔ ﴿ يكون الدين كله لله ﴾ ایک ایسی صورتحال پر منتج ہے جسے ﴿ كلمة الله هي العليا ﴾ کہا جا سکے۔ پھر یہ بات بھی بہت واضح انداز سے بتا دی گئی ہے کہ متبعین محمدؐ کی خدا شناسی انہیں کسی الگ دین پر قائم نہیں کرتی بلکہ یہ وہی دین براہیمی ہے جس پر تمام انبیاء سابقین اور متبع نفوس گامزن رہے ہیں۔ لہذا آج ہم جن معنوں میں دینی مسائل یا دینی علوم کی بات کرتے ہیں دین کی کسی ایسی تعریف سے قرآن مجید کے صفحات خالی ہیں۔ اس سرزمین پر انسانوں کو جو بھی مسئلہ درپیش ہو قرآن چاہتا ہے کہ انسان اسے کتاب وسنت کی روشنی میں حل کرے۔ اس کے برعکس اگر بعض مسائل کو اہل دنیا کے لئے اور بعض کو دین پرستوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تو مسائل کی یہ غیر فطری تقسیم فتنہ وفساد کا باعث ہوگی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانی زندگی کا دین اور دنیا کی تفریق میں بٹا ہونا اسلام سِرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا اور وہ پوری انسانی زندگی کو کافۃً خدا کی اتباع میں دینے کا مطالبہ کرتا ہے تو پھر طبقۂ علماء کے لئے اس بات کی گنجائش کیسے نکل آئی کہ وہ خود

کو دینی امور کا ماہر بتائیں اور عام انسانوں کو اس بات کی ترغیب بھی دیں کہ وہ دینی امور میں رہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھیں۔ عام طور پر اہل فتاویٰ اپنے اس مخصوص سماجی رول کے لئے ﴿فاسئلوا اهل الذکر﴾ والی آیت کا سہارا لیتے ہیں جس سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید اہل ذکر کے ایک طبقہ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ مذہبی پیشوائی کا فریضہ انجام دے۔ البتہ آیت کو اس کے سیاق وسباق میں پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں اہلِ ذکر سے مراد دراصل علماء اہل کتاب ہیں جو وحی کے نزول کی روایت سے واقف ہیں جن کے لئے قرآن مجید کی دعوت اجنبی نہیں' لہذا جو لوگ اس آیت کو طبقۂ علماء کے وجود کے لئے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ دراصل اہل یہود کی طرح ﴿یحرفون الکلم عن مواضعه﴾ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک دوسری آیت جو اس سلسلہ میں بار بار دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے وہ سورہ توبہ کی آیت ﴿فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین و لینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم﴾ ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے کو پوری آیت کے ساتھ پڑھئے اور پھر اسے اس سیاق میں رکھئے جہاں یہ آیت وارد ہوئی ہے تو اس سے صرف یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ تمام مومنوں کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ اجتماعی طور پر جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوں بلکہ مسلمانوں کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ امور اجتماعی کی فہم وبصیرت کے لئے اپنے آپ کو مصروف رکھیں تو جہاد سے واپسی کے بعد اجتماعی زندگی کو منظّم کرنے میں یہ اہلِ علم معاون ثابت ہوں گے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو اس طرح بھی سمجھا ہے کہ ہر انسانی گروہ میں کچھ لوگ اپنے آپ کو فہم دین کے لئے مصروف کریں تاکہ وہ جب اپنی قوم کے پاس حصولِ علم کے بعد واپس آئیں تو انہیں تقویٰ شناسی کی ریت پر قائم رکھنے میں معاون ہوں۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں لفظ دین سے مراد رسومِ عبودیت، فقہی علوم یا نماز، روزے اور طہارت کے مسائل نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد خدا شناسوں کا اجتماعی نظام ہے اور کسی اجتماعی نظام کو چلانے کے لئے امور اجتماعیت کے ایسے ماہرین' جو وحی کی غایت سے واقف ہوں' ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ کہنا کہ اس آیت کے مخاطب موجودہ دور کے طبقۂ علماء ہیں تو یہ دراصل قرآن مجید کی اس آیت کا مذاق اڑانا ہے۔ جب یہاں دین سے مراد علماء کا مزعومہ دین نہیں تو پھر اس ''دینِ علماء'' کے ماہرین قرآن کے مخاطب کیسے ہوسکتے ہیں۔

عیسائی خانقاہوں اور متصوفین کے حلقوں میں ڈاکٹر آف ڈویینیٹی کی ڈگری عہد وسطیٰ میں خاصی معروف رہی ہے۔ ان بھاری بھرکم اصطلاحوں پر مبنی ڈگریوں کی تقسیم کے ذریعہ اہل کلیسا دراصل عام انسانوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ عیسائی علماء جنہوں نے اپنی زندگیاں خانقاہوں کی نذر کی ہیں انہیں دینی علوم کے سلسلے میں سند کا اعتبار حاصل ہے۔ لوتھر کے ریفارمیشن سے پہلے اور خود اس کے عہد میں عیسائی حلقوں میں یہ بحث شدّ ومد کے ساتھ جاری رہی کہ کلیسا اہم ہے یا بائبل؟ اور یہ کہ کیا کلیسا کو بائبل پر ہر حال میں ترجیح دینا چاہئے؟ اہل کلیسا یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ بائبل کی تمام تشریح وتعبیر کا حق صرف اور صرف پوپ اور

ان کے مصاحبین کو حاصل ہے۔ دوسری تعبیریں خواہ اسے بائبل کی آیتوں سے کیوں نہ مدلل کیا گیا ہو پوپ کی سند کے بغیر اسے اعتبار نہیں مل سکتا۔ تشریح وتعبیر پر طبقۂ علماء کی اجارہ داری کا یہ خیال اہل یہود کے یہاں بھی اسی طرح معروف ہے جہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں ربائی اکیوا تورات کے بہتر شارح ہیں۔ بلکہ یہودی علماء تو اس خیال کے بھی قائل ہیں کہ جب خدا نے ایک بار تورات بندوں کے حوالے کردی تو اس کی تشریح وتعبیر اب علماء یہود کے بغیر ممکن نہیں۔

گو کہ اسلام میں کسی طبقۂ علماء کی اجارہ داری کی سخت نکیر کی گئی تھی لیکن عملاً ہوا یہ کہ عالم، فاضل، مفتی، قاضی اور محدث ومفسر جیسی اصطلاحوں میں ڈگریاں تقسیم کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ ہمیں ایک ایسے التباس فکری کی طرف لے گیا جہاں ہم یہ سمجھنے لگے کہ عالم یا فاضل کی ڈگریاں رکھنے والا شخص یا مفتی اور قاضی کا لاحقہ لگانے والا ہمارے ہی جیسا انسان اب ان لاحقوں کے ساتھ ایک ایسی مسند پر متمکن ہے 'جہاں مستند ہے اس کا فرمایا ہوا'۔ حالانکہ مدارسِ عربیہ میں عالمیت اور فضیلت کے دس بارہ سالوں پر مشتمل جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا ایک سرسری جائزہ لینے سے بھی یہ بات بآسانی واضح ہوجاتی ہے کہ محض ان چند کتابوں کی ورق گردانی کے بعد کسی شخص کو عالم بمعنی صاحبِ علم کہنا مناسب نہیں۔ جدید اسکولوں کے نصاب میں گزشتہ نصف صدی میں بڑی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے اور مسلسل اس بات کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ بدلتی دنیا میں معلومات کے نئے مآخذ سے نئی نسل کو پوری طرح واقف رکھا جائے لیکن اس کے باوجود ہم میں سے شاید ہی کوئی اس بات کی توقع کرتا ہے کہ ہمارے ہائر سکینڈری اسکول کے فارغین فکری اور عقلی اعتبار سے اتنے پختہ ہوں گے کہ صاحبِ علم کی حیثیت سے دنیا ان کے مشوروں پر انحصار کرے گی۔ اس کے برعکس یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کا علمی سفر تو اب شروع ہوا ہے، آگے یونیورسٹی کی فضا اور تحقیق وتجزیے کی مجلسیں ان میں تنقیدی نظر اور بصیرت پیدا کرسکیں گی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ مدارس عربیہ کی ثانوی درسگاہوں کے فارغین کی دس بارہ سالہ تعلیم کو علم و تحقیق کا کمال سمجھا جائے اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں کہ ثانوی سطح کے یہ فارغین ہماری رہنمائی کے لائق ہوگئے ہیں اور یہ کہ ان کے کلام کو اب دین میں برہان قاطع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، ایسا سمجھنا ان فارغین کے ساتھ ظلم سے کم نہیں۔

بھلا جو لوگ ابھی علوم کی ثانوی درسگاہ سے فارغ ہوئے ہوں اور وہ بھی ایسی درسگاہیں' جہاں گزشتہ کئی صدیوں کے علمی ارتقاء کو داخلِ نصاب بننے سے روکے رکھا گیا ہو' انہیں قیادت کے بلند منصب پر کیسے فائز کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوا تو اس قیادت سے آپ کیا توقع کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں ارشاد ہے ﴿هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون﴾ لیکن عملی دنیا میں ہم اس عقلی رویے کی پاسداری نہیں کرتے۔ اصحابِ فقہاء اور اصحاب افتاء کی مجلسوں میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ نئے مسائل کی تفہیم وتشریح اور اس پر کوئی شرعی حکم لگانے کے لئے پہلے تو ایسے ماہرین فن کی خدمت حاصل کی جاتی ہے جسے اس خاص مسئلہ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ پھر صاحبِ فن کی زبانی مسئلہ کے مالہ وماعلیہ کو سمجھنے کے بعد اصحابِ فقہ اس بارے

میں جائز و ناجائز، حلال و حرام کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے استعمال کے سلسلے میں جب علماء سے اس کے جواز کا فتویٰ پوچھا گیا تو اس بارے میں اہل علم فقہاء و مجتہدین کی ایک مجلس منعقد کی گئی، اب چونکہ علماء ان تکنیکی آلات کے مالہ و ماعلیہ سے واقف نہیں تھے اس لئے انہوں نے ایک ماہر فن کی خدمت مستعار لی۔ چند خطبات کی روشنی میں علماء نے انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی' اور پھر جیسا کہ عموماً ہوتا آیا ہے' اس کے جواز اور عدم جواز پر وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ ٹیلی ویژن پر تصویروں کا آنا حرمتِ تصویر کے حوالے سے قابل انگیز نہیں ہے تو کسی کی رائے تھی کہ مالکی مکتبۂ فکر سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسی تصویریں ہیں جس کا سایہ نہیں بنتا اس لئے مباح ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب مائکروفون پر اذان کا مسئلہ علماء کے سامنے آیا تھا تو اس وقت کے علماء نے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مائکروفون میں آواز کی حقیقت ہے کیا؟ یعنی وہ اصل آواز ہے یا اس کا عکس۔ اب چونکہ جدید طبیعات علماء کے حیطۂ علم سے باہر تھی اس لئے وہ قریبی اسکول میں سائنس ٹیچر ماسٹر سیتارام سے اکتساب فیض پر مجبور ہوئے جنہوں نے یہ بتایا کہ مائکروفون میں آواز کا بڑھ جانا دراصل کسی وادی میں آواز کی گونج سے مشابہ ہے۔ اس تفہیم کے مطابق چونکہ مائکروفون کی آواز گونج یا عکس کے قبیل سے تھی اس لئے اصل آواز کے مقابلہ میں عکس کو لائق اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ البتہ آگے چل کر علماء کا سائنسی فہم ماسٹر سیتارام سے کہیں زیادہ عقیل و فہیم اصحاب فن کے تابع ہوا تو وہ اس بات کو پا گئے کہ اس آلہ میں اصل آواز کو ہی کئی گنا بڑھانے کی صلاحیت ہے۔ رفتہ رفتہ مائکروفون نے قبولیت عامہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ کسی نے جب مولانا اشرف علی تھانوی سے گراموفون پر قرآن کی تلاوت کے سلسلہ میں پوچھا تو انہوں نے گراموفون کو آلۂ طرب بتا کر اس کے ذریعہ قرآن مجید سننے کو مکروہ قرار دیا۔ البتہ آج آڈیو، ویڈیو کیسٹ، وی سیڈیز، ڈی ویڈیز کی مختلف شکلوں کے رواج پا جانے کے بعد اب ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ان CDs کی حیثیت مغنیوں اور رقاصاؤں کے کوٹھوں کی ہے جہاں سے ہمہ وقت نغمہ و طرب کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ علماء کے یہاں ٹیلی ویژن کے حلال و حرام کے بارے میں جو دو رائے پائی جاتی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے یہاں یہ مسئلہ فیصل نہیں ہو سکا ہے کہ ٹیلی ویژن پر آنے والی تصویروں کی حیثیت ہے کیا؟ یہ عکس ہیں یا اصل۔ بعض تو اس بنیاد پر اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ یہاں لائیو ٹرانسمیشن (live transmission) میں بولنے والے کا عکس مثل آئینہ منتقل ہوتا ہے اگر وہ شخص کیمرے کے سامنے سے ہٹ جائے تو یہ عکس خود بخود غائب ہو جاتا ہے۔ بعض کہتے کہ لائیو ٹرانسمیشن کو بھی دوبارہ relay کیا جاسکتا ہے۔ گویا یہاں تصویر کی حفاظت کا سامان موجود ہے اس لئے اسے مباح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بعض علماء فقہ حنفی میں تصویروں کی سخت گیر حرمت کے باوجود اس بات کے قائل ہیں کہ ٹیلی ویژن سے دعوتِ حق کی نشر و اشاعت کا کام لیا جانا چاہئے اور بعض اس بارے میں پر جوش ہیں کہ خود طبقۂ علماء کو دین حق کی اشاعت کے لئے اپنے راست کنٹرول میں ٹیلی ویژن کے مراکز

قائم کرنے کی ضرورت ہے لیکن ان تمام ''شرعی'' آراء کے باوجود عام مسلمانوں کے لئے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہے کہ خدا کی نازل کردہ شریعت میں ان آلات جدیدہ کے بارے میں واقعی حکم ہے کیا؟ کوئی اس کے فوائد کا شمار کرتا ہے تو کوئی کہتا ہے اثمهما اكبر من نفعهما۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جو لوگ آلات جدیدہ کی تکنیکی باریکی کو سمجھنے کے اہل نہیں وہ اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے کی جسارت کیسے کرتے ہیں کہ انہیں اپنی اپنی آراء پر فتویٰ کا گمان ہو اور وہ عام انسانوں سے اس کی پیروی کی توقع کریں۔ گزشتہ دنوں سائنس کے مستقبل کے سلسلہ میں غور وفکر کے لئے اٹلی کے سیاحتی مقام وینس میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں stem-cell پر ہونے والی اب تک کی تحقیق پر دن بھر بڑی جوش و خروش کے ساتھ بحث ہوتی رہی۔ کلوننگ کے سلسلہ میں مذہبی حلقوں میں جو تحفظات پائے جاتے ہیں اس کا بھی کھل کر ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں مجمع فقہ اسلامی جدہ اور جامعہ ازہر کے فتاووں کا بھی تذکرہ آیا۔ اہل سائنس کو اس بات کی شکایت تھی کہ اس بارے میں مذہبی حلقوں سے جو آراء آئی ہیں ان کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات مسئلے سے فی نفسہ واقف ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسئلہ پر اب تک جو گفتگو ہوتی رہی ہے اس میں ایک پہلو تو پروپیگنڈہ عنصر کا ہے۔ بعض محققین پروپیگنڈے کی زبان میں یہ باور کراتے رہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں DNA کو شاہ کلید کی حیثیت حاصل ہوگی جس کے ذریعہ صحت اور سیکورٹی کے شعبہ میں حیرت انگیز کام لیا جاسکے گا۔ رہی یہ بات کہ کلوننگ واقعی خدائی تخلیق میں انسانی مداخلت سے عبارت ہے تو اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنے کے لئے متخصصین جیسی نظر ہونی چاہئے جس کے بغیر مسئلہ پر کوئی بات سائنس فکشن کے انداز میں کلام کرنا ہوگا۔

یہ خیال کہ بعض انسانی تحقیق خدائی تخلیق میں مداخلت سے عبارت ہے اور یہ کہ ایسا کرنا مسند خدائی پر فائز ہونے کی کوشش ہے دراصل ایک مغالطہ سے کم نہیں۔ کائنات، جیسی کہ اللہ نے پیدا کی ہے، اپنے اندر بے شمار اسرار و رموز کی حامل ہے۔ روزِ اول سے انسانی تہذیب کا سفر انہی اسرار و رموز کی دریافت اور ان پوشیدہ قوتوں کو مسخر کرنے سے عبارت ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ انسان اس کائنات کی تسخیر کرے۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور اسی بارش سے اس سرزمین پر مختلف رنگوں کی فصلوں کا پیدا ہونا ایک ایسا مبہوت کردینے والا عمل ہے جس پر غور وفکر انسان پر خشیت الٰہی طاری کردیتی ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں اصل عالم کہا جاسکتا ہے: ﴿ انما يخشى الله من عباده العلماء ﴾۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف یہ فیصل کرنے بیٹھ گئے کہ دیگر قومیں جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ان کا کون سا عمل شریعت میں مباح ہے اور کون سا حرام؟ یا یہ کہ ان کی کون سی ایجادات کو لائق استعمال قرار دیا جاسکتا ہے

اورکون سی ایجاد پر عدم جواز کا فتویٰ چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ تو یہ ذہنی رویہ ہمیشہ ہمیں محض ان کے تعاقب میں مشغول رکھے گا اور ہم کبھی اس لائق نہیں ہوسکیں گے کہ دنیا ہماری اتباع اور اقتداء میں چلے۔ بھلا یہ کونسا شرعی علم ہے جس کے حاملین دنیا کی قیادت کے بجائے ایجادات واختراعات کرنے والوں کے تعاقب میں رہتے ہوں اور جنہوں نے اپنا محض یہ فریضہ سمجھ رکھا ہو کہ ان کا کام آلات جدیدہ کی تحلیل وتحریم یا مباح وجواز کا فتویٰ دینا ہے۔

جولوگ طبقۂ علماء کو وارثینِ علومِ نبوت سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ آخری رسولؐ کے متبعین کی حیثیت سے بعثت محمدیؐ سے تاریخ کے آخری لمحے تک انسانی قافلے کی رہنمائی کا فریضہ انہیں ہی انجام دینا ہے۔ موجودہ دنیا میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، وسائل کا چند ہاتھوں میں ارتکاز اور پوری دنیا کا سرمایہ داروں کے زبردست شکنجے میں کس جانے کا عمل ایک ایسا کریہہ منظر نامہ ہے جسے آخری رسولؐ کے متبعین ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ ماحولیات کی تباہی، موسموں کی غیر فطری تبدیلی، فطری وسائل کا اندھا دھند استعمال جیسے مسائل نے کرۂ ارض کے مستقبل کے سلسلہ میں جن شدید اندیشوں کو جنم دیا ہے اس کا مداوا بھی متبعین محمدؐ کو کرنا ہے۔ آنے والے دنوں میں روایتی ایندھن پیٹرول کے بجائے متبادل توانائی کیا ہوسکتی ہے؟ کیا ہائیڈروجن ایندھن کے ذریعہ ماحولیات کی آلودگی کو کم کیا جاسکتا ہے؟ یہ اور اس جیسے دسیوں سوالات کے اصل مخاطب دراصل آخری وحی کے حاملین متبعین محمدؐ ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ جولوگ اقوام عالم کی قیادت پر فائز کئے گئے تھے اور جن سے یہ توقع تھی کہ وہ آیات اللہ فی الکون میں غور وفکر کے ذریعہ ایجادات واختراعات کی قیادت کریں گے، وہ علم کی ایسی خود ساختہ تشریح وتعبیر کے اسیر ہوگئے کہ انہوں نے کائنات میں غور وفکر کو سِرے سے اپنے وظیفے سے خارج کر دیا۔ عالم کی قرآنی تعریف سے دور شرعی اور غیر شرعی علوم کی ثنویت انہیں فکری زوال کی ایک ایسی دنیا میں لے گئی جہاں فقہاء یہود کی طرح ان کا کل وظیفہ شرعی اور غیر شرعی جیسی اصطلاحوں میں کلام کرنا طے پایا۔ حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب میں حلال وحرام کی تفصیلات کھول کھول کر بیان کردی ہیں اور یہ بات بھی بتادی گئی ہے کہ ﴿ منه آيات محكمات هن ام الكتاب و اخر متشابهات فأما الذين فى قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة ﴾۔ رہے وہ لوگ جو راسخون فی العلم تھے تو ان سے تو یہی توقع تھی کہ قیل وقال سے پرے ہوکر کہہ اٹھیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ عقل اس بات کو کیسے تسلیم کرسکتی ہے کہ جولوگ آلات جدیدہ کی ماہئیت کے سلسلہ میں دوسرے ماہرین کے محتاج ہوں اور جواب تک ٹیلی ویژن کی تصویروں کے سلسلہ میں اصل اور عکس کی بحث میں الجھے ہوں انہیں تو مسئلہ پر قول فیصل کہنے کا حق حاصل ہو البتہ وہ ماہرین جن کی ان مسائل اور آلات پر واقعی نظر ہو ان کے کلام کو اس بارے میں کوئی اعتبار حاصل نہ ہو۔